# "حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت"

## "البلاغ" کے خصوصی نمبر پر تبصرہ

(۲)

اس بات کو پہلے اجمالاً بیان کیا جا چکا ہے کہ بدعت کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے بلکہ اسے امرِ مسنون کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کہ سُنّی و بدعی طلاق۔ اب میں مدیر "البلاغ" کو ذرا کھول کر بتانا چاہتا ہوں کہ متعدد فقہاء و ائمہ نے امیر معاویہؓ کی بہت سی ایسی اوّلیات کو بھی بدعت قرار دیا ہے جن کے حق میں شرعی دلائل بھی موجود ہیں اور بعض فقہاء و محدثین بھی جن میں امیر معاویہ کے ہمنوا ہیں۔ مثال کے طور پر قضاء بالیمین والشاہد کے مسئلے کو لیجیے۔ اس میں امیر معاویہؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ مدعی اگر اثباتِ دعویٰ کے لیے دو گواہ پیش نہ کر سکے تو ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کی تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے اور بعض فقہاء کا یہ مسلک بھی ہے۔ اب اس کے بعد "التوضیح" کا یہ قول دیکھیے جو علامہ صدر الشریعۃ نے شرائط راوی کے ضمن میں درج کیا ہے اور جسے میں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں۔

**اوّلیاتِ معاویہؓ پر اطلاق بدعت** | ذکر فی المبسوط ان القضاء بشاھد ویمین بدعۃ واوّل من قضی بہ معاویۃ۔

مبسوط میں مذکور ہے کہ ایک گواہ اور ایک قسم کی بنیاد پر فیصلہ کرنا بدعت ہے اور جنہوں نے سب سے پہلے ایسا فیصلہ کیا، وہ معاویہؓ ہیں۔

(التوضیح والتلویح، مطبوعہ نولکشور ص ۳۱۱ بسنہ ۱۲۹۲ھ)

اس کے بعد مؤطا امام محمد، باب الیمین مع الشاہد کا قول ملاحظہ ہو:

ذکر ابن ابی ذئب عن ابن الشھاب — ابن ابی ذئب روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے امام

الزھری قال سألتہ عن الیمین مع الشاھد فقال بدعۃ واول من قضیٰ بہ معاویۃ۔

زہری سے ایک قسم اور ایک گواہ کے بل پر فیصلہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے اور پہلے جنہوں نے ایسا فیصلہ کیا وہ حضرت معاویہؓ ہیں۔

اس مقام کی شرح میں مولانا عبدالحی مرحوم "التعلیق الممجد" میں لکھتے ہیں:

قال ابن ابی شیبۃ حدثنا حماد بن خالد عن ابن ابی ذئب عن الزھری قال ھی بدعۃ واول من قضیٰ بھا معاویۃ وفی مصنّف عبد الرزاق اخبرنا معمر عن الزھری قال ھٰذا شیئ احدثہ الناس لابد من شاھدین (الموطا لامام محمد مع التعلیق الممجد، ص ۳۶۱ مطبع مصطفائی، ۱۲۹۷ھ)

ابن ابی شیبہ حماد بن خالد سے اور وہ ابن ابی ذئب سے اور وہ امام زہریؒ سے راوی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ یہ (فیصلہ) بدعت ہے اور پہلا ایسا فیصلہ امیر معاویہؓ نے کیا۔ اور مصنّف عبدالرزاق میں ہے، ان سے معمر نے اور انہوں نے زہری سے روایت کی ہے کہ امام زہری نے کہا کہ یہ فیصلہ لوگوں نے نیا اور نرالا نکال لیا ہے۔ اثباتِ دعویٰ کے لیے دو گواہوں کا ہونا لازم ہے۔

شرح الوقایہ، کتاب الدعویٰ میں اسی قضا بیمین وشاہد کے متعلق درج ذیل قول ملاحظہ فرمائیے:

عندنا ھٰذا بدعۃ واول من قضیٰ بہ معاویۃ۔

ہمارے نزدیک اس طرح کا فیصلہ بدعت ہے اور امیر معاویہؓ نے سب سے پہلے ایسا کیا۔

(شرح الوقایہ مع حاشیہ چلپی، مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۶ھ ص ۲۵۹)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے المسوّٰی والمصفّٰی شرح الموطا کا ایک اقتباس میں پہلے دے چکا ہوں موطا امام مالک، کتاب الزکوٰۃ میں امام زہری ہی کی ایک روایت یوں ہے:

عن ابن شھاب انہ قال اول من اخذ من الاعطیۃ الزکوٰۃ معاویۃ ابن ابی سفیان۔

ابن شہاب سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے جنہوں نے سرکاری عطیات میں سے زکوٰۃ وصول کی، وہ معاویہؓ ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ امیر معاویہؓ لوگوں کو عطیے دیتے وقت ہی ان عطیات پر پیشگی زکوٰۃ لے لیتے تھے

حالانکہ پہلے ایسا دستور نہ تھا۔ اب دیکھیے یہاں امام زہریؒ نے تو بدعت کا لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب اس کی شرح فرماتے ہیں :

یعنی گرفتن زکوٰۃ از سالیانہ و ماہیانہ در وقتیکہ کسی را دادہ شود بدعت است۔ — یعنی سالانہ و ماہانہ عطایا پر کسی کو دیتے وقت ہی زکوٰۃ وصول کرنا بدعت ہے۔ (المصفیٰ ص۲۰۷)

کیا اس کا صاف مطلب نہیں ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے امام زہری کے الفاظ اول من اخذ کا مدعا یہی قرار دیا ہے کہ یہ بدعت ہے؟ تو پھر مولانا مودودی نے اگر امام زہری کے بعینہٖ اسی طرح کے الفاظ (اول من قصرھا) سے یہ مراد لے لیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا اور عمرؒ بن عبدالعزیز نے بدعت کو ختم کیا، تو آخر کونسا ناقابلِ عفو جرم کر لیا؟ سلف سے خلف تک سارے اصحاب جنہوں نے امیر معاویہؓ کی بدعات کا ذکر کیا ہے جناب مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ کو چاہیے کہ کوئی فتویٰ اُن حضرات کی پاکیزہ ارواح تک بھی رسید فرمائیں اور ساری قوت مولانا مودودی اور میرے خلاف ہی نہ صرف کرتے رہیں۔ اگر اس فہرست میں اضافہ مطلوب ہو، تو بندہ اس کے لیے بھی حاضر ہے۔ مولانا عثمانی صاحب کو یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سارے اقتباساتِ مذکورہ بالا میں امیر معاویہؓ کے جن فیصلوں پر بدعت کا اطلاق کیا گیا ہے، ان کے حق میں دلائلِ شرعیہ موجود ہیں۔ ایک قسم اور ایک گواہ کی موجودگی میں بعض حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعی کے حق میں فیصلہ حدیث میں مذکور ہے جسے مؤطا امام محمد وغیرہ میں نقل بھی کیا ہے اور امام شافعیؒ امام احمد اور امام مالک کا یہی مسلک ہے۔ اسی طرح پیشگی زکوٰۃ لینے کی گنجائش قواعدِ شرعیہ میں نکل سکتی ہے مگر احادیث مشہورہ و مستفاضہ اور تعاملِ خلافتِ راشدہ سے متعارض ہونے کی بنا پر ان سب اصحاب نے امیر معاویہؓ کے قضایا کو بدعت قرار دیا ہے۔ نیز ان حضراتِ احناف کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو گواہوں کا نصاب شہادت مقرر کیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ شہادت مدعی کے ذمّے ہے اور قسم انکارِ دعویٰ کرنے والے مدعا علیہ کے لیے ہے۔

"ترجمان" کے گزشتہ شمارے میں یہ امر ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مسلمان کو کافر کا وارث بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ کتاب و سُنّت اور اجماعِ خلافتِ راشدہ کے خلاف تھا۔ اس پر صحیح معنوں

میں نہ اجتہاد کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ اسے سُنّت یا سُنّتِ ثانیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پُوری سلطنت کے اندر اس کا نفاذ و رواج بدعت کی تعریف میں آتا ہے اور صرف مولانا مودُودی نے نہیں بلکہ دوسرے اصحاب سلف نے بھی اسے بدعت اور باطل قرار دیا ہے۔

مسئلۂ دیت | اب مَیں مولانا مودودی کی دوسری عبارت نقل کرتا ہوں جس پر "البلاغ" میں تنقید کی گئی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

"حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سُنّت کو بدل دیا۔ سُنّت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی، مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی۔"

مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اس عبارت پر چار اعتراض کیے تھے۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ مولانا مودُودی نے یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے کہ دیت کے معاملے میں حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا۔ اس اعتراض کا جواب وہی ہے جو پہلے توریث والے حوالے کے متعلق دیا جا چکا ہے۔ اس مقام پر بھی مولانا مودُودی نے ابن کثیرؒ کے قول کی بالمعنی روایت اپنے الفاظ میں کی ہے اور اپنی عبارت کا ایک جز بنا کر کی ہے اگر مولانا ابن کثیر کے قول کا بعینہٖ لفظی ترجمہ کرتے تو ترجمے کو الگ سطور میں یا واوین میں دیتے۔ مگر انہوں نے مفہوم کی اپنے الفاظ میں ترجمانی کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ ان الفاظ سے بھی زیادہ محتاط ہیں جو مسئلۂ توریث میں مولانا محترم نے استعمال کیے ہیں۔ وہاں بدعت[1] کا لفظ لکھا تھا اور یہاں صرف یہ لکھا ہے کہ "سنت کو بدل دیا"۔ اب اس جملے پر یہ اعتراض تو بالکل بے محل ہے کہ اسے مولانا نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے کیونکہ یہ ان کی اپنی عبارت ہی کا ایک حصہ ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ حافظ ابن کثیر کے قول کی توضیح کے طور پر بھی یہ فقرہ صحیح نہیں کہ امیر معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، تو اس اعتراض میں بھی کوئی وزن نہیں ہے۔ آخر ابن کثیر

---

[1] یہاں یہ بات بھی قابل وضاحت ہے کہ توریث والے مسئلے میں بھی مولانا مودُودی کے الفاظ یہ نہیں کہ امیر معاویہؓ نے بدعت کا ارتکاب کیا، بلکہ اصل الفاظ یہ ہیں کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا" اور "حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آ کر اس بدعت کو موقوف کیا مگر ہشام نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کر دیا"۔

عجب فرما رہے ہیں کہ پہلے سُنت یہ چلی آ رہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے مساوی ہو، اور حضرت معاویہؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دیت کو نصفا نصف کر کے آدھی اپنے لیے مختص کر لی، تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سنت کو بدل دیا؟

یہاں ایک اور بات جس کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خلافت و ملوکیت میں مولانا نے جتنے مراجع و مآخذ کا حوالہ دیا ہے، ان کی اصل عربی عبارتیں شاذ و نادر ہی کہیں درج کی ہیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ حوالے اتنے کثیر و متعدّد تھے کہ سب کا اندراج کتاب کو کم از کم پانچ چھ گُنا ضخیم بنا دیتا اور پھر لاطائل تکرار اور تحصیلِ حاصل بالکل عبث ہوتی لیکن عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ دیت والی بحث کے اس خاص مقام پر مولانا مودودی نے اپنی کتاب ص ۱۷۴ کے حاشیے پر ابنِ کثیر کا وہ اصل جملہ بھی نقل کر دیا ہے جس میں ترمیم و تحریف کا الزام مولانا کے خلاف عائد کیا گیا ہے۔ مولانا حاشیہ ۲۶ میں لکھتے ہیں:

"ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں: وکان معاویۃ اول من قصرھا الی النصف واخذ النصف لنفسہ۔"

اب اگر مولانا کا ارادہ واقعی یہی ہوتا کہ وہ ابن کثیر کی طرف کوئی غلط بات منسوب کریں یا ان کے مفہوم میں کوئی نا روا اور غیر جائز اضافہ کریں تو انہیں اصل عربی عبارت نقل کر دینے میں ضرور تأمل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اصل الفاظ دے دینے کے بعد تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ یہاں لفظی ترجمہ مقصود نہ تھا کہ اس میں تبدیلی یا اپنی طرف سے کچھ بڑھا دینے کا سوال پیدا ہو سکے۔ اس کے بعد بھی اس الزام کو برابر رگڑے چلے جانا کہ "اصل کتاب میں یہ جملہ بالکل موجود نہیں ہے، نہ ابن کثیرؒ نے یہ جملہ کہا، نہ امام زہریؒ نے" اسے خواہ مخواہ کی خوردہ گیری کے ماسوا اور کس پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح اگر ہندی کی چندی نکالنی شروع کی جائے تو کونسا مصنّف ہے جو اعتراضات سے بچ سکے؟ اگر مدیر البلاغ میری بات کو پھر طعنِ اکابر نہ سمجھ بیٹھیں تو مَیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کے ایک ترجمے سے بعض اصحاب نے عبارتیں اور فقرے چُن چُن کر جمع کر لیے تھے اور انہیں "تحریفِ قرآن" کے عنوان سے چھاپ دیا تھا حالانکہ ایک مسلمان جتنی احتیاط کتاب اللہ کے ترجمے اور ترجمانی میں کرتا ہے کسی دوسری تصنیف کے معاملے میں نہیں کرتا۔

"دلچسپ غلطی" جناب عثمانی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ومضت السنۃ ان دیۃ المعاھد کدیۃ المسلم۔۔۔۔ یہ ابن کثیر کا نہیں بلکہ امام زہریؒ کا قول ہے اور میرا یہ سمجھنا اور کہنا غلط ہے کہ یہ ابن کثیرؒ کا قول ہے۔ یہ اعتراض بڑی اہمیت کے ساتھ البلاغ میں دُہرایا گیا ہے اور اس پر "ایک دلچسپ غلطی" کا عنوان قائم کرکے دو صفحے سے زائد میری تضحیک کی نذر کیے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:

"مدیر البلاغ کو ملک صاحب سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوسکی لیکن عربی مدارس کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ یہ محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہے کہ جب وہ ایک سند سے کسی کا ایک مقولہ ذکر کرتے ہیں اور پھر آگے اسی سند سے اسی شخص کا دوسرا مقولہ نقل کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مقولے میں سند کا اعادہ کرنے کے بجائے شروع میں وبہٖ قال کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بہٖ کی ضمیر سند کی طرف راجع ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ سند ہی سے اس کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔۔۔۔۔ بہرکیف جس شخص کو حدیث اور تاریخ کی عربی کتابوں سے ادنیٰ ممارست بھی رہی ہو وہ اس حقیقت میں شبہ نہیں کرسکتا کہ دیت کے بارے میں یہ مقولہ امام زہری کا ہے۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ملک صاحب کے لیے اتنا اشارہ غلط فہمی کا سبب بن جائے گا اور وہ جواب میں ہمیں بہٖ قال کے مفہوم سے باخبر کرنے کی سعادت عطا فرمائیں گے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اہلِ علم کے لیے اتنا اشارہ کافی ہوگا۔"

مَیں اِس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میری عمر کا بہترین حصہ اسکول اور کالج میں ضائع گیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مودودی کو جزائے خیر عطا فرمائے، جب ان کی ایمان افروز تحریروں اور تقریروں نے میرے نظریات کو بدلا، تب مجھے عربی اور دینی علوم سے تہی دستی کا شدید احساس ہوا۔ مَیں نے جس حد تک بھی بن پڑا اپنی محرومی و تشنگی کو رفع کرنے کی کوشش کی مگر افسوس کہ مَیں ان علوم و آداب کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل نہ کرسکا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حدیث، فقہ اور تاریخ کی ورق گردانی کے باوجود میں بہٖ قال کے اس مفہوم سے اب تک نابلد رہا کہ یہ جملہ بھٰذا الاسناد قال کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اس پر کوئی صاحب جتنا مذاق چاہیں اڑالیں۔ میری نظر سے بہٖ قال کا جو استعمال اب تک گزرا ہے یا جو میری یادداشت میں محفوظ

رہ سکا ہے وہ یہی ہے کہ بالعموم جہاں پہلے ایک مسلک مذکور ہوتا ہے یا مذہبِ فقہی یا استنباط و اجتہاد کو بیان کیا جاتا ہے، وہاں متصلاً بعد بہٖ قال کہہ کر جن بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ موخرالذکر بھی مقدم الذکر مسلک کے قائل و حامل ہیں۔ مثلاً سنن ترمذی، باب الاستنجاء بالحجارہ میں پہلے حدیث اور پھر اکثر صحابہ کرام کا یہ مسلک منقول ہے کہ پتھر سے استنجاء کافی ہے پھر امام ترمذی فرماتے ہیں وبہ یقول الثوری وابن المبارك والشافعی واحمد واسحاق۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ سب حضرات بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ اسی طرح مسح علی الخفین میں حدیث اور مسلکِ صحابہ کے بیان کے بعد فرماتے ہیں و بہ یقول مالك والشافعی واسحاق۔ آگے مسح علی الجوربین کے باب میں بھی اسی طرح کے الفاظ موجود ہیں۔ جس جگہ رائے اور قولِ فقہی میں مماثلت کے بجائے سند میں مماثلت ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، وہاں محدثین کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ بہ یقول یا بہ قال کے بجائے بھٰذا الاسناد نحوہ یا بھٰذا السند، مثلہ من ھذا الوجہ یا صرف بہ لاتے ہیں۔ مثلاً اسی ترمذی میں آگے باب ان الماء من الماء آتا ہے۔ اس میں پہلے سند ہے: حدثنا احمد بن منیع ثنا عبد اللہ بن المبارك اخبرنا یونس بن یزید عن الزھری عن سھل بن سعد عن ابی بن کعب قال ... اس کے بعد دوسری حدیث میں چونکہ امام زہری سے حضرت ابیؓ تک سلسلہ اسناد وہی ہے جو پہلی حدیث میں ہے، اس لیے فرماتے ہیں عن الزھری بھٰذا الاسناد مثلہ۔ بہ قال اور بھٰذا الاسناد قال کے یہ دونوں بالکل الگ استعمالات سُنن ترمذی میں بے شمار ہیں۔ مثال کے طور پر باب یقرأ القرآن علی کل حال میں حدیث کے بعد فرمایا ہے وبہ قال غیر واحد من اھل العلم اور آگے باب ما جاء فی تاخیر العصر میں پہلے ابن جریج کی ایک روایت ہے، پھر دوسری ہے جس میں عن ابن جریج بھٰذا الاسناد نحوہ کے الفاظ آئے ہیں۔

امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں بکثرت روایات ایسی ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ سے کوئی حدیث یا اثر مروی ہوتا ہے اور اس کے بعد امام محمد یہ بھی لکھ دیتے ہیں وھو قول ابی حنیفۃ جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ تک جو روایت پہنچی ہے وہ یہ ہے اور جو مسلک یا مسئلہ اس روایت سے ثابت یا مستنبط ہے، امام صاحب کا فقہی مسلک بھی وہی ہے۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں یہی انداز اختیار کیا ہے

مثلاً نکاح بغیر ولی کے باب میں ابن جریج سے حضرت عائشہؓ تک ایک سلسلۂ اسناد ہے۔ پھر دوسری روایت میں چونکہ ابن جریج سے اوپر تک سند وہی ہے، اس لیے اس کی تکرار کے بجائے فرماتے ہیں باسنادہ مثلہ۔ اس کے برعکس جہاں بھی سند کے بجائے مسلک کا ذکر مقصود ہوتا ہے تو لکھتے ہیں: ذھب الی ھذا الحدیث قوم فقالوا بہ (ملاحظہ ہو زکوٰۃ السائمہ) یا یوں لکھتے ہیں وھذا قول ابی حنیفۃ وابی یوسف ومحمد۔ امام مسلم اپنی الصحیح کے باب الاسلام وخصالہ میں پہلے ابوحیّان کی ایک سند بیان کرتے ہیں، پھر انہی کی دوسری سند کا ذکر یوں فرماتے ہیں: حدثنا ابوحیّان التیمی بھذا الاسناد مثلہ۔ آگے باب قول لا الٰہ الا اللہ میں جہاں ابوطالب کی وفات کا ذکر ہے، وہاں پہلے ابن شہاب زہری کی ایک روایت ایک سند کے ساتھ ہے، پھر انہی کی دوسری حدیث درج کرنے سے پہلے لکھتے ہیں عن الزھری بھذا الاسناد مثلہ۔ اس طرح کی مثالیں امام مسلم کے ہاں بکثرت موجود ہیں۔ لیکن بہ قال سے مراد بھذا السند قال ہو، اس کی کوئی مثال میری نگاہ سے نہیں گزری، البتہ جب سند یا اس کے حصے اور متن دونوں میں مماثلت ہو، تو رواہ ...

... بہ کا اسلوب آتا ہے۔ پھر بہ پر بالعموم جملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بہ قال سے نئی روایت نہیں آتی۔

میرے وجوہِ ترجیح | اس کے باوجود بہ قال کہہ کر اگر سابق سند کو مراد لینا محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہو اور میرے سوا ہر ادنیٰ واعلیٰ طالب علم اس سے شناسا ہو تو ایسی صورت میں حدیث کی کتابوں میں اس کے بے شمار نظائر موجود ہونے چاہییں۔ مَیں مدیر البلاغ کا شکر گزار ہوں گا اگر وہ چند مثالیں البلاغ میں نقل کر دیں۔ یا پھر مدیر موصوف یا قارئین میں سے کوئی دوسرے صاحب ذاتی طور پر مجھے مطلع فرما دیں۔ میری غلط فہمی و لاعلمی رفع ہو جائے گی۔ لیکن مَیں پھر بھی عرض کروں گا کہ اس طرح بلاشبہ ایک علمی نکتہ تو مجھ پر منکشف ہو جائے گا لیکن یہ بات پھر بھی بحث طلب رہے گی کہ بہ قال سے جو کچھ مَیں سمجھ رہا ہوں وہ درست ہے یا وہ مفہوم صحیح ہے جو مولانا عثمانی صاحب باصرار لے رہے ہیں۔ بشرطِ صحت پھر بھی گنجائش دونوں کی ہو گی اور میری غلطی دلچسپ ہو سکتی ہے تو ان کی کیوں نہیں ہو سکتی؟ واحد وجہ ترجیح جو مولانا عثمانی صاحب نے اپنے حق میں دی ہے وہ یہ ہے کہ اگر بہ قال کا تعلق توریث مسلم سے ہو، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ امام زہریؒ نے حضرت معاویہؓ کے فیصلے کو صحیح سمجھا اور جس چیز کو وہ بدعت سمجھتے ہیں اسی کو اپنا مذہب بھی بنا لیا ہے۔

مولانا عثمانی صاحب کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ یہاں قال الزھری کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے فیصلے کو صحیح قرار دے کر اُسی کو اپنا مذہب فقہی بنا رہے ہیں۔ امام زہری توریث کے باب میں جو اصل بات بیان کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ سُنت جو پہلے سے چلی آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ نہ کافر مسلم کا وارث ہو اور نہ مسلم کافر کا اور یہی امام زہری کا فقہی مسلک بھی ہے۔ اس طرح کی تصریح کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ محدثین کی دیانت و امانت کا یہ ثمرہ ہے کہ وہ اپنے مسلک کے خلاف روایات بھی بلا تامل نقل کر دیتے ہیں۔ امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو امیہ نے تو اس کے خلاف کیا، سوائے عمرؒ بن عبدالعزیز کے جنہوں نے اس سُنّت کو بحال کیا۔ بھلا امام زہری اس فیصلے کو کیسے صحیح قرار دیں گے جو سُنتِ ماضیہ کے موافق نہ ہو جبکہ وہ آغاز ہی میں یہ بتا رہے ہیں کہ ان کے نزدیک سنت یہ تھی کہ کافر و مسلم کے مابین توارث نہ ہو؟ یہ فی الواقع عجیب صورت ہے کہ مدیر "البلاغ" میرے اخذ کردہ مطلب کو طرفہ تماشا فرما رہے ہیں اور جو طرفگی ان کے اپنے استنباط میں ہے اُسے ملاحظہ نہیں فرماتے! امام زہری کی ایک روایت مؤطا امام محمد، باب لا یرث المسلم الکافر میں ایسی بھی موجود ہے جس میں امام مالک ان سے نقل کرتے ہیں کہ عقیل اور طالب چونکہ ابوطالب کی وفات کے وقت کافر تھے، اس لیے وہ ابوطالب کے وارث ہوتے اور حضرت علیؓ وراثت سے محروم رہے، کیونکہ وہ اسلام لا چکے تھے۔

مدیر البلاغ نے اپنے حق میں جو استدلال کیا ہے، اس کے جواب میں میرے اختیار کردہ مفہوم کے لیے مزید وجوہ ترجیح بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً البدایہ کے جتنے مختلف ایڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں ان میں وبہٖ قال الزھری کے بعد الٹی واؤ ( ، ) کا نشان موجود ہے اور یہ علامت بالعموم وصل کے بجائے فصل اور وقف کا فائدہ دیتی ہے اور سند اور متن کو اس علامت سے باہم جدا نہیں کیا جاتا۔ پھر سند کا آغاز واؤ سے ہو، اس کی کوئی مثال بھی یاد نہیں پڑتی۔ تاہم ان سب باتوں کو چھوڑتے ہوئے اور اپنا امکانِ خطا مانتے ہوئے مَیں مولانا محمد تقی صاحب کے اس فیصلے کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتا ہوں کہ جس شخص کو حدیث و تاریخ کی کتابوں سے ادنیٰ ممارست بھی رہی ہو، وہ اس حقیقت میں شبہ نہیں کر سکتا کہ دیت کے بارے میں زیرِ بحث مقولہ حافظ ابنِ کثیر کا نہیں بلکہ امام زہری کا ہے، حافظ ابن کثیر نے صرف اسے نقل کیا ہے۔" مَیں نے تو پہلے ہی ترجمان (جون ۱۹۶۹ء) میں عرض کر دیا تھا کہ نفس مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قائل خواہ ابن کثیر ہوں یا امام

زہری، قول یہی بیان ہوا ہے کہ سُنّت یہ چلی آ رہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہو"۔ مدیر البلاغ پھر میرے جواب میں فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ کا قول ہونے کی صورت میں اس قول کی تشریح سُنَنِ بَیْہقی میں مروی امام زہری کے دوسرے قول کی مدد سے آسان ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس طرح کوئی آسانی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دوسرا قول بھی یہی ہے کہ " یہودی و نصرانی کی دیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان کی دیت کے برابر تھی، اور حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا"۔ باقی رہی سنن بیہقی کی یہ تشریح کہ امیر معاویہؓ آدھی دیت ورثاء کو دیتے تھے اور باقی نصف بیت المال میں داخل کرتے تھے (اس لیے آدھی دیت کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا سوال نہیں) تو اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مَیں نے سابق بحث میں واضح دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا تھا کہ دیت کے کسی حصے کو بیت المال میں لینے کا جواز بھی نہ قرآن سے نکلتا ہے، نہ سنت میں اس کا ثبوت ملتا ہے، نہ اُمّت کے کسی فقیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

**لِنفسہ اور لبیت المال کی بحث** مدیر" البلاغ" نے میرے استدلال کے اس اصل پہلو کا تو کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں روایتوں میں لنفسہ اور لبیت المال کے لفظی اختلاف پر جو کچھ مَیں نے لکھا ہے، صرف اس کی تردید میں سارا زور صرف کر دیا۔ لکھتے ہیں کہ افسوس ہے کہ " ملک غلام علی صاحب کو اب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ حضرت معاویہؓ آدھی دیت ذاتی استعمال ہی کے واسطے لیتے تھے اور بیہقی کی روایت میں جو بیت المال کا لفظ آیا ہے اس سے مراد بھی حضرت معاویہؓ کی ذات ہی ہے"۔ افسوس جس طرح مدیر البلاغ کو ہے، اسی طرح مجھے بھی ہے کیونکہ وہ میری بات کو غلط مفہوم پہنا رہے ہیں۔ مَیں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ حضرت معاویہؓ دیت اپنی ذات پر استعمال کرتے تھے۔ مَیں نے جو کچھ کہا ہے اور جسے خود انہوں نے نقل بھی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو اُمیّہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لیے ایک ہی واقعہ میں مؤرخین نے کہیں لِنَفْسِہٖ اور کہیں لبیت المال کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لیے استعمال ہونے لگا تھا اور اُمراء بیت المال کے آمد و خرچ کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جوابدہ نہ رہے تھے"۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جسے تمام مؤرخین نے بیان اور تسلیم کیا ہے۔ مَیں نے اس بات کو زیادہ کھول کر بیان کرنا مناسب اور ضروری نہیں سمجھا تھا، لیکن بڑا افسوس ہے کہ مدیر البلاغ نے یہ پھر مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ

کوئی دلیل ایسی پیش کی جاتے جس سے یہ دعویٰ ثابت ہو۔ مَیں نے جب پہلا سلسلۂ مضامین لکھا تھا اور اس میں ایک جگہ مولانا مودودی کا یہ فقرہ نقل کیا تھا کہ امیر معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے لیے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لی تھی، اس وقت بھی بعض حضرات نے مجھ سے کہا تھا کہ تخویف کے ثبوت میں تو تم نے بخاری کی حدیث نقل کر دی تھی (جس میں امیر معاویہؓ کا یہ قول مروی ہے کہ کون ہمارے مقابلے میں اپنا سینگ اونچا کر سکتا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے سے محض اس وجہ سے رُک گئے کہ انہیں خوں ریزی کا ڈر تھا) لیکن تم نے طمع دلانے کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔

اب مدیرِ "البلاغ" اور دوسرے مطالبہ کرنے والے اصحاب کو میں خلافت و ملوکیت کے ص ۱۴۹۔۱۵۰ کا حوالہ دیتا ہوں، جہاں ایسی متعدد مثالیں درج ہیں، بالخصوص الکامل اور البدایہ کے حوالے سے یہ درج ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت ابن عمرؓ ہی کو بیعتِ یزید پر آمادہ کرنے کے لیے ایک لاکھ درہم بھیجے تھے مگر انہوں نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ پھر تو میرا دین بڑا سستا ہو گیا۔ یہ واقعہ بکثرت مؤرخین و محدثین نے نقل کیا ہے مثلاً طبقات ابن سعد ج ۴، ص ۱۸۲، ترجمہ عبداللہ ابن عمرؓ مطبوعہ دار بیروت، دار صادر ۱۳۷۷ھ پر یہی قول موجود ہے۔ پھر میں امام محی الدین النووی کی ایک عبارت پیش کرتا ہوں جو کہ صحابۂ کرام کے محلِ نظر افعال و اختلافات پر کلام کرنے میں حد درجہ محتاط ہیں۔ انہوں نے تہذیب الاسماء واللغات میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر الصدیق کے مختصر حالات درج کر کے آخر میں لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| ولمّا ابی البیعۃ لیزید بن معاویۃ بعثوا الیہ بمائۃ الف درھم لیستعطفوہ فردّھا وقال لا ابیع دینی بدنیای رضی اللہ عنہ۔ | جب انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تو ان کی طرف ایک لاکھ درہم بھیجے گئے تاکہ انہیں بیعت پر مائل کیا جائے، انہوں نے انہیں رد کر دیا اور فرمایا کہ دنیا کے عوض میں دین نہیں بیچ سکتا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ |

یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں بیعت سے مراد امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کے لیے خلافت کی بیعت ہے۔ امام نوَوِی نے اسی ترجمے میں خود لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کی وفات مختلف اقوال کے مطابق ۵۳ھ یا ۵۵ھ یا ۵۶ھ میں ہوئی اور معلوم ہے کہ امیر معاویہؓ کا انتقال وسط ۶۰ھ

میں ہوا۔ اس لیے یہاں بیعت سے مراد یزید کی ولی عہدی کی بیعت ہے جس کے لیے ۵۰ھ ہی سے کوشش شروع ہوگئی تھی۔ لیکن جیسا کہ امام نوویؒ کا انداز ہے، انہوں نے امیر معاویہؓ یا ولی عہدی کا نام لیے بغیر پوری بات بیان کر دی، اور اس کتاب میں کر دی جو ایک چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں چھانٹ کر مواد جمع کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ زیادہ تصریح کے ساتھ دوسرے مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ مثال کے طور پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

بعث معاویة الی عبد الرحمٰن بن ابی بکر بمائة الف درھم بعد ان ابی بیعة لیزید ابن معاویة فردھا عبد الرحمٰن وابیٰ ان یأخذھا وقال: ابیع دینی بدنیای؟ (البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۸۹)

معاویہؓ نے عبد الرحمٰن بن ابی بکر کی طرف ایک لاکھ درہم اس وقت بھیجے جب انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے انہیں رد کر دیا اور انہیں لینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا "کیا میں اپنے دین کو دنیا کے عوض میں فروخت کر دوں؟"

اب کیا مدیرؔ "البلاغ" مجھے بتا سکتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس اتنا فراواں مال کہاں سے آگیا تھا اور کیا ان اغراض کے لیے اسے خرچ کرنا صحیح تھا خواہ یہ رقوم ذاتی ہوں یا بیت المال کی ہوں؟ صحیحین میں روایت موجود ہے کہ جب فاطمہ بنت قیس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا کہ میں معاویہؓ سے نکاح کر لوں؟ تو آنحضورؐ نے فرمایا انه صعلوك (وہ تو بالکل نادار ہیں)۔

اگر مدیرؔ "البلاغ" ان نظائر اور میری بحثِ سابق میں بیان کردہ دلائل و شواہد کے باوجود مجھ سے ایسی دلیل کا مطالبہ کرتے رہیں "جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت معاویہؓ نے بیت المال کی رقوم اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کر دی تھیں" تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ مثالیں مزید بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر ان کا جواب بھی غالباً مدیر البلاغ "تبرعاً" یہی دیں گے جو وہ اب دے رہے ہیں کہ تین جمعے کے خطبوں میں امیر معاویہؓ فرماتے رہے کہ ساری دولت ہماری دولت ہے، تو آخری جمعے میں ایک شخص نے کہا کہ مال تو سارا ہمارا ہے، جو شخص درمیان میں حائل ہوگا، ہم اس کا فیصلہ تلوار سے کرائیں گے۔ اس پر امیر معاویہؓ نے اس کو انعام دیا۔ نیز امیر معاویہؓ نے ایک خطبے میں بیت المال کے بقایا تقسیم کرنے کا اعلان فرمایا۔

یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ فلاں صاحب نے یہ اور یہ اچھے کام کیے تھے تو اب ان سے کوئی غلط فعل صادر نہیں ہو سکتا یا وہ ایسی ایسی فضیلت و منقبت کے مالک ہیں، اس لیے معصوم عن الخطاء ہیں۔ اِس طرزِ استدلال سے تو ہر ثابت و واقع غلطی کو کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر دو ہفتے تک ہر شخص کی خاموشی کے بعد تیسرے ہفتے ایک شخص کا لب کُشا ہو سکنا جس سنگین صورت پر دلالت کرتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

**میرا سوال و اشکال** پھر مولانا عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "چوتھا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ یہ مسئلہ عہدِ صحابہ ہی سے مختلف فیہ چلا آتا ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی یا اس سے آدھی یا تہائی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں مختلف احادیث مروی ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے متعارض احادیث میں تطبیق دی، آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دلوائی اور آدھی بیت المال کو۔ ملک صاحب نے اس کے مقابلے میں اپنے دلائل پیش کیے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ پوری بحث بالکل غیر متعلق ہے۔" اب یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال ہے کہ مولانا عثمانی صاحب نے یہاں میری بحث کے مرکزی پہلو کا نہ ذکر کیا ہے، نہ اس کا کوئی جواب ہی دینے کی کوشش کی ہے۔ بس اُسے غیر متعلق کہہ کر بیچ میں سے صاف اُڑا دیا ہے۔ ویسے تو میں نے ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کے ترجمان میں دیت کے مسئلے پر پانچ صفحے لکھے ہیں لیکن آخری تین صفحوں میں میرا جوابی اشکال و اعتراض واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے جس کی تردید میں ایک لفظ تک تازہ البلاغ میں موجود نہیں ہے۔ میرے لیے اور قارئین کے لیے یہ چیز اکتاہٹ کی موجب ہو گی کہ میں ساری بحث کو دہراؤں۔ تاہم میں بعض ضروری حصے دوبارہ مجبوراً نقل کرتا ہوں۔ میں نے مدیر البلاغ کا استدلال نقل کرنے کے بعد لکھا تھا:

"میں نے جہاں تک غور کیا ہے، امیر معاویہؓ کا یہ اجتہاد فی نفسہٖ نصوصِ کتاب و سنت کے خلاف ہے اور اس سے احادیثِ مختلفہ میں توفیق و تطبیق کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے قرآن مجید سے رجوع کیا جائے تو وہاں سُورۂ نساء، آیت ۹۲ میں مومن اور کافرِ معاہد، دونوں کے قتلِ خطا کے معاملے میں دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ قرآنی الفاظ کی مماثلت اور مساواتِ دیت کی روایات (مثلاً دية ذمی کدية مسلم، تتكافأ دماءهم وغیرہ) صحابہ و تابعین اور فقہاء مجتہدین کے اسی مسلک کی تائید کرتی ہیں کہ دونوں

دیتیں برابر ہیں اور امام سرخسی کے قول کے مطابق اس کے خلاف آثار پایۂ صحت کو نہیں پہنچتے۔ تاہم اس امر سے مجالِ انکار نہیں کہ اس مسلک کے خلاف بھی روایات و آثار موجود ہیں، اس لیے بعض مذاہبِ فقہیہ نے کافر معاہد کی دیت کو مسلم کی دیت کا نصف یا ایک تہائی قرار دیا ہے لیکن قرآن مجید میں مسلم اور معاہد دونوں کی دیت کے متعلق مُسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان کی دیت ہو یا کافر معاہد کی، بہرحال وہ پوری کی پوری مقتول کے اہلِ خاندان کے حوالے کر دی جائے[1]۔ قرآن کا ارشاد اس معاملے میں بالکل ناطق اور صریح ہے جس میں اس تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں کہ دیتِ مقررہ کا کوئی حصّہ مقتول کے وارثوں کے بجائے کسی دوسرے کے پاس جائے۔ اِلٰٓی اَھْلِہٖ کے الفاظ میں الیٰ امیر المومنین یا الیٰ بیت المال کا مفہوم آخر کس طرح داخل کیا جا سکتا ہے؟ اگر کسی تاویل یا کسی مصلحت کی رُو سے معاہد کی دیت کا کوئی حصّہ مسلمانوں کے بیت المال میں جا سکتا ہے تو پھر مسلمان کی دیت کا کوئی حصّہ کیوں نہیں جا سکتا؟ روایات و آثار میں دیتوں کے تناسب و مقادیر میں تو اختلاف ضرور مذکور ہے لیکن کوئی گری پڑی روایت بھی مجھے نہیں مل سکی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ذمّی یا معاہد کی دیت، خواہ وہ دیتِ مسلم کے مساوی ہو یا ½ یا ⅓، اس کا کوئی حصّہ بیت المال میں بھی جا سکتا ہے.... دیتوں کا اختلاف و عدمِ مساوات اور چیز ہے اور ان میں سے کسی جُز کا بیت المال میں جانا اور چیز۔ اس دوسری چیز کا ثبوت اگر امیر معاویہؓ کے سوا کسی اور سے ملتا ہو، تو اسے پیش کیا جانا چاہیے۔"

مدیر البلاغ نے اپنی پرانی یا تازہ بحث میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کہ کس دلیلِ شرعی کی بنا پر ذمّی مقتول کے اولیاء کو دیتِ مقررہ کے کسی حصّے سے محروم رکھا جا سکتا ہے؟ انہوں نے سارا زور لنفسہٖ کو لبیت المال ثابت کرنے پر لگایا ہے۔ میں کہتا ہوں، چلیے تسلیم کر لیا کہ لنفسہٖ کا لفظ جن مؤرخین نے لکھا ہے، ان کی مراد لبیت المال تھی، تب بھی دیت کے کسی حصّے کا بیت المال میں لینا کس رُو سے جائز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مسلمان کو کافر کا وارث بنانا صحیح نہیں، اسی طرح کسی مسلمان فرد یا بیت المال کو غیر مسلم کی دیت

[1] میں نے اس فقرے کو خاص طور پر جاذبِ توجہ کرنے کے لیے اس پر خط بھی کھینچ دیا تھا۔

میں حصہ دار بننا بھی درست نہیں۔ دیت ایک طرح کا ترکہ و ورثہ ہے جس کا مقتول کے اہل و اولیاء میں تقسیم ہونا واجب ہے۔ جس طرح مسلم و غیر مسلم کے مابین توارث ممنوع ہے اور کافر کا ورثہ کافر ہی کو ملتا ہے، اسی طرح کافر کی دیت، جو کچھ بھی ہو، وہ اس کے کافر وارثوں ہی کو ملتی ہے۔ ان دونوں معاملوں میں حضرت معاویہؓ سے یکساں غلطی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسلمان کی کافر سے توریث منقطع کر دی اور ذمّی کی دیت تو آدھی ہی رہنے دی مگر اتنی آدھی جو امیر معاویہؓ نے بیت المال کے لیے مقرر کی تھی اُسے موقوف کر دیا۔

علماء مفسّرین کی تشریحات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم و غیر مسلم مقتول دونوں کی پوری دیت ان کے اولیاء کو ملے گی۔ اس کا کوئی حصّہ کسی دوسری جانب نہیں جا سکتا۔ سورۂ نساء کی آیتِ دیت کے جس جُز کا اطلاق معاہد یا ذمّی پر بھی ہوتا ہے، اس کی تفسیر میں امام ابن جریر کافر مقتول کے متعلق لکھتے ہیں:

لزمت قاتله دیته لان له ولقومه عهدًا فواجب اداء دیته الی قومه للعهد الذی بینهم وبین المومنین وانها مال من اموالهم ولا یحل للمومنین شیئ من اموالهم۔

اس کافر مقتول کے قاتل پر اس کی دیت لازم ہے کیونکہ اس کافر اور اس کی قوم سے عہد کیا جا چکا ہے پس اس کی دیت کا اس کی قوم کو ادا کیا جانا واجب ہے کیونکہ اس قوم اور مومنین کے مابین معاہدہ ہے اور یہ دیت کافر کے اہل قوم کے اموال میں سے ہے اور مومنین کے لیے ان کے مال میں سے کوئی شے بھی حلال نہیں۔

امام ابن جُریرؒ کے اس ارشاد سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذمّی کی دیت کے حقدار اس کے کافر اعزہ ہیں، مسلمانوں کے لیے یہ مال حلال ہی نہیں ہے، خواہ وہ مسلمان افراد ہوں یا مسلمانوں کا بیت المال ہو۔ ابن جریرؒ نے اپنے اس قول کے حق میں متعدد دیگر اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ بعض فقہا نے ذمّی کی دیت بیت المال میں داخل کرنے کی صرف ایک شاذ صورت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی ذمّی کے اولیاء میں سے کوئی بھی اگر موجود نہ ہو، تب اس کی دیت بیت المال میں لی جائے گی، ورنہ دوسری کسی حالت میں بھی اُسے بیت المال میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

خود مدیر "البلاغ" محرم ۱۳۹۱ھ کے تازہ البلاغ میں اپنے مضمون بعنوان "اسلامی دستور کا مفہوم" کے ص ۱۰ پر لکھتے ہیں:

"غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو (بشرطیکہ وہ مرتد نہ ہوں) بنیادی طور پر وہی انسانی حقوق حاصل ہوں گے، جو مسلمان باشندوں کو حاصل ہیں:

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ (۴ : ۹۲)

اور اگر (خطاءً قتل ہو جانے والا) ایسی قوم میں سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے (یعنی ذمی ہو) تو اس کے رشتہ داروں کو دیت سپرد کرنی ہو گی۔"

اسی آیت کی روشنی میں میری یہ گزارش ہے کہ جب قرآن مجید صاف طور پر بیان کر رہا ہے کہ ذمّی کی دیت اس کے رشتہ داروں کو سپرد کرنی ہو گی، تو پھر اس کا کوئی حصہ بیت المال میں لینا کیسے جائز ہو گا اور اگر ذمّی کے معاملے میں یہ جائز ہو گا تو مسلمان کی دیت کیوں پوری کی پوری اس کے رشتہ داروں کو دی جائے گی اور اس کا کوئی جزء بیت المال میں کیوں نہ لیا جائے گا؟ کیا مولانا عثمانی صاحب کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب ہے؟ (باقی)